بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دنیا کی کسی انقلابی تحریک کو اگر کسی اجتماعی جدوجہد سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو وہ کسی قافلے کا ایک خاص منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں ہونا ہے۔ قافلے کو ترتیب دینے والا سب سے پہلے منزل کا تعین کرتا ہے۔ پھر اس منزل تک رسائی میں جو مادی اور روحانی کامرانیاں اسے نظر آتی ہیں ان سے عامۃ الناس کو روشناس کراتا ہے اور انہیں زیرِ ترتیب قافلے میں شریک ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ پھر جب قافلہ چلنے کے لیے تیار ہوتا ہے تو اس کے لیے زادِ راہ کا انتظام کرتا ہے، شرکاءِ قافلہ کی صلاحیتوں، استعداد کار اور جذبہ و شوق اور مقصد کے ساتھ لگن کا جائزہ لیتا ہے۔ اور انہیں اس راہ کے نشیب و فراز سمجھاتا ہے اور اس راہ پر پہلے جو قافلے گامزن ہو چکے ہیں اُن کی کامیابیوں اور ناکامیوں اور ان کے اسباب و علل سے انہیں پوری طرح آگاہ کرتا ہے۔ اور اس راہ میں جو حوادث اور مصائب خاص خاص مقامات پر اُسے پیش آ سکتے ہیں اُن کی نشاندہی کرتا ہے۔

جماعت اسلامی اپنی ساری کمزوریوں اور کوتاہیوں کے اعتراف کے باوجود کسی فخر کی بناء پر نہیں بلکہ بڑے انکسار کے ساتھ یہ بات علیٰ وجہ البصیرت کہتی ہے کہ اس کی منزلِ مقصود وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی تھی اور جس کا نہایت واضح طور پر تعین خاتم المرسلین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور اس کے کارکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے اپنی حد تک اُسی جادہ مستقیم پر گامزن ہونے کی کوشش کر رہے ہیں جس پر پاکباز لوگوں نے چل کر منعم حقیقی کی رضا اور خوشنودی حاصل کی اور دنیا اور آخرت میں اس کی نعمتوں سے بہرہ ور ہوئے اور ان خوفناک راستوں سے بچنے کے لیے فکرمند رہتے ہیں جو ضلالت اور گمراہی کی طرف لے جانے والے اور خدا کے غضب کو برانگیختہ کرنے والے ہیں۔

جماعت اسلامی کی جدوجہد کا مقصد بجز اس ایک مقصد کے اور کوئی نہیں کہ انسان کو انسان کی

غلامی سے آزاد کرا کر اپنے خالق اور مالک کا غلام بن کر رہنے کا سلیقہ سکھایا جائے۔ خداوند تعالیٰ کی بندگی اور اس کی غلامی اگرچہ بڑی دلکش اصطلاحیں ہیں اور انسان ان کی دلکشی سے مسحور ہو جاتے ہیں لیکن جب کوئی شخص قرآن و سنت کی روشنی میں ان کے مضمرات پر غور کرتا ہے اور تاریخ کے دریچے سے اُن لوگوں کے مصائب و شدائد پر نگاہ دوڑاتا ہے جو بندگیِ رب کے علمبردار بن کر اٹھے تو پھر پہاڑ پر قرآن حکیم کے نزول سے اس کے لرزاں و ترساں ہونے کا عقدہ کسی حد تک کھل جاتا ہے۔ اگر بندگیِ رب محض ایک تصور اور نظریہ ہوتا تو پھر یہ کسی وجہ سے بھی باعث اضطراب نہ تھا۔ نہ اس نظریہ کے اپنانے والوں کو اس کی عظیم ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے لرزہ براندام ہونے کی ضرورت پیش آتی اور نہ اس نظریہ کے مخالفین کو اس سے کوئی ایسا شدید خطرہ لاحق ہوتا جس سے اُن کی نیندیں حرام ہو جاتیں۔ اس نظریہ کے قبول کرنے والے محض ذہنی آسودگی کی خاطر اسے قبول کرتے اور اس کے مخالفین جذبہ رواداری کے تحت اسے بخوشی برداشت کرتے۔ بندگیِ رب کے دعوے میں اصل مشکل کا آغاز وہاں سے ہوتا ہے جہاں یہ عقیدہ انسان سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ تم ساری بندگیوں کو چھوڑ کر خواہ یہ بندگی وقت کے جباروں اور قہاروں کی ہو، سرمایہ داروں اور زرداروں کی ہو یا عوام کے مذہبی جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے والوں کی ہو، یا اپنے مفادات اور اپنے نفس کی ہو، خدائے واحد کی بندگی اختیار کرو۔ اسلام کا کلمہ طیّبہ گو نہایت ہی مختصر سا کلمہ ہے لیکن اس میں ایک مسلمان پر احقاق حق اور ابطال باطل کے سلسلے میں جو غیر معمولی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں انہیں بڑی خوبصورتی کے ساتھ سمیٹ دیا گیا ہے۔ بندگیِ رب کا دعویدار اس کلمہ کو زبان سے ادا کر کے اس عزم کا خلوصِ دل سے اظہار کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں تمام معبودانِ باطل کی غلامی کا جوا اتار کر خدائے واحد کی غلامی اختیار کرے گا کیونکہ یہی اس کے نزدیک خالق کا بندہ ہونے کی حیثیت سے اس کے لیے صحیح راستہ ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ باطل کی ہر صورت کو مٹانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔ یہ کلمہ اگر بندۂ مومن کے لیے قوت و طاقت کا سرمدی سرچشمہ ہے تو معبودانِ باطل کے لیے خوفناک چیلنج بھی ہے جسے سنتے ہی اُن کے حلقوں میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ اور باطل اپنے سارے ساز و سامان کے ساتھ میدان میں اتر پڑتا ہے۔ حق جس قدر قوت کے ساتھ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے باطل اسی شدت کے ساتھ اس کی مزاحمت کرتا ہے۔ لیکن تاریخ کا فیصلہ یہی ہے کہ باطل اہل حق کے لیے سخت مصیبت اور آزمائش کا باعث تو بنتا ہے مگر اس کی پیش قدمی کو روک نہیں سکتا۔ بشرطیکہ اہل حق نے اس راہ کی دشواریوں کو دیکھ کر خود ہمت نہ ہار دی ہو۔

ہمارے پیش نظر اس وقت حق و باطل کی باہمی آویزش کی پوری تاریخ دہرانا نہیں بلکہ اس قافلے کی طے کردہ چند منازل کی نشاندہی مقصود ہے جو پاکستان بلکہ پوری دنیا میں جماعت اسلامی کے نام سے متعارف و معروف ہے۔

اس قافلہ کے سالار نے سب سے پہلے مسلمانوں کو بندگیِ رب کے حقیقی مفہوم اور اُس کے مقتضیات سے ایک داعی حق کے جوش، تدبر اور دلسوزی کے ساتھ آشنا کیا اور انہیں یہ بتایا کہ دین حق خدا اور بندے کے درمیان کوئی ذاتی تعلق ہی نہیں بلکہ یہ پوری زندگی کو حق پرستی کی بنیاد پر استوار کرنے کا جامع پروگرام ہے اور اس درجہ باطل کی ہر صورت کے لیے بربادی اور موت کا پیغام ہے۔ مسلمانوں نے اپنے مذہبی جذبات کی تسکین کے لیے باطل کے اندر اسلام کے لیے جو مختلف گوشہ ہائے عافیت تلاش کرنے کی کوششیں کی ہیں یا اس سے مصالحت کے لیے انہوں نے جو مختلف راستے نکال رکھے ہیں اُن سے وہ مقصد پورا نہیں ہوتا جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے دین کو نازل فرمایا ہے۔ جس طرح روشنی اور تاریکی یک جا نہیں ہو سکتیں بالکل اسی طرح حق و باطل ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہ سکتے۔ جہاں حق ہوگا وہاں باطل کے لیے کوئی گنجائش نہ ہوگی اور اسے بہرطور وہاں سے اپنی بساط لپیٹنی ہی پڑے گی خواہ وہ معمولی مزاحمت کے ساتھ یہ کام کرے یا پوری طرح پنجہ آزمائی کر کے پسپائی اختیار کرے۔

تحریکِ اسلامی کے قافلہ سالار نے جب مسلمانوں کو دینِ حق کے اس انقلاب انگیز تصور سے آشنا کیا جسے وہ کچھ عرصہ سے بھول چکے تھے تو اس کا مختلف حلقوں میں مختلف ردِ عمل ہوا۔ بعض نے کہا یہ شخص دین حق کو ایک دنیوی تحریک کی صورت میں چلانے کی مذموم کوشش کر رہا ہے۔ بعض لوگ جن کے ذہنوں میں یہ بات اچھی طرح رچ بس چکی تھی کہ دین محض نماز روزے اور چند اخلاقی پابندیوں کا نام ہے انہوں نے اس دعوت کو کسی نئے دین کی تشکیل تصور کیا اور اسے فتنہ سمجھتے ہوئے اس سے خائف ہونے لگے۔ اس وقت کے ایک نہایت ہی واجب الاحترام صاحب حال اور صاحبِ قال بزرگ، جو کسی پر الزام دھرنے کے معاملہ میں اپنے حلقے کے دوسرے اہلِ علم کی بہ نسبت کہیں زیادہ محتاط سمجھے جاتے تھے، اُن کے سامنے جب اس تحریک کی بنیادی کتب پیش کی گئیں اور ان سے مطالعہ اور اپنی رائے ظاہر کرنے کی درخواست کی گئی تو انہوں نے ان تحریروں کا جائزہ لینے کے بعد ارشاد فرمایا۔ میں ان میں کسی صریح غلطی کی تو نشاندہی نہیں کر سکتا۔ البتہ دل ان باتوں کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہا۔

جماعت اسلامی کے قائد اور اس کے افکار و تصورات کے بارے میں جو کچھ بھی پاکستان اور بھارت میں لکھا گیا ہے اس کے معتد بہ حصے کے مطالعہ کا مجھے موقع ملا ہے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جن اصحاب علم نے خلوص اور دیانت داری کے ساتھ جماعت اسلامی کی دعوت سے اختلاف کیا ہے اس کی سب سے بڑی وجہ دین کا وہ جامع تصور ہے جسے مولانا نے مسلم قوم کے دور انحطاط میں پیش کیا ہے اور جو عام مذہبی ذہن کو اپیل نہیں کرتا۔ ابتلاء اور انحطاط کے دور میں عوام عافیت کے گوشے اور حالات کے دھارے کے ساتھ آرام اور سکون کے ساتھ بہنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اور اہل مذہب نے اس کا ہمیشہ یہی ایک حل پیش کیا ہے کہ روح کی تسکین کے لیے عبادت اور گیان دھیان تو مذہب کے مطابق کر لیا جائے اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں غالب نظام حیات کی پیروی کی جائے۔ اس سے روح کو بھی غلط یا صحیح ایک طرح کی غذا فراہم ہوتی رہتی ہے اور انسان بغیر کسی تصادم یا بہت بڑی آزمائش کے باطل کی تجویزوں سے فائدہ بھی اٹھاتا رہتا ہے۔ اور "باغبان بھی خوش رہے اور راضی رہے صیاد بھی" کی ذہنی کیفیت کے ساتھ زندگی گزارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اس ذہنی کیفیت پر لوگوں کو جھنجھوڑا جائے اور انہیں یہ بتایا جائے کہ جس چیز کو تم روحانی سکون اور دنیوی کامیابی قرار دے رہے ہو یہ اللہ کے دین سے یکسر مغائرت رکھتی ہے تو لوگوں کا اس پر برہم ہونا بالکل فطری امر ہے۔ البتہ علمائے کرام سے اس کی توقع نہ کی جا سکتی تھی مگر افسوس کہ انہوں نے بھی اس دعوت پر سنجیدگی سے غور کر کے اس کا ساتھ دینے کے بجائے یا تو معنی خیز سکوت اختیار کیا یا پھر اس شد و مد سے مخالفت شروع کی گویا یہ کوئی نیا فتنہ اٹھ کھڑا ہوا تھا جس کا مٹانا ان کا فرض تھا۔

حلقہ علماء سے باہر جو لوگ اہل فرنگ کی زیادہ سے زیادہ وفاداری بلکہ اُس کی بندگی کے ذریعے مسلم قوم کے لیے دنیوی فوائد حاصل کرنے میں منہمک تھے اور اسے اپنی دانست میں بہت بڑی ملی خدمت خیال کرتے تھے انہوں نے بھی تحریک اسلامی کی دعوت کو ملت دشمنی سے تعبیر کیا اور روشن خیال مسلمانوں کو یہ کہہ کر اس سے بدظن کرنے کی کوشش کی کہ اس تحریک کا داعی قرآن مجید کی آیت اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ج کا سہارا لے کر تمہیں سرکارِ انگریزی کی برکات سے محروم رکھنا چاہتا ہے اس لیے تمہیں اس کی آواز پر کوئی توجہ نہ دینی چاہیئے۔ اگر تم نے انگریز سے عدم تعاون کی روش اختیار کر لی تو دوسری قومیں اس سے فائدہ اٹھا کر اس کی منظورِ نظر بن جائیں گی اور اس طرح تمہارے حصے کے دنیوی فوائد بھی اُن کی جھولی میں

ڈال دیئے جائیں گے۔

اس دعوت کا ردعمل یوں تو زندگی کے ہر میدان میں ظاہر ہوا مگر سیاسی میدان میں یہ خاص طور پر شدید جھٹکوں کی صورت میں نمودار ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب مولانا محترم نے تحریک اسلامی کی بنیاد رکھی اس وقت وطنی قومیت کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور مسلم قومیت کا قافلہ بھی ابتدائی منازل طے کر کے جد وجہد کے وسیع میدانوں میں داخل ہو رہا تھا۔ وطنی قومیت کے بت پر جب انہوں نے ضرب کاری لگائی اور لوگوں کو بتایا کہ مغرب میں نیشنلزم کی تحریک پروان چڑھنے سے یا دوسرے لفظوں میں وطن کو خدا بنانے سے انسانیت کو کس قسم کے ناقابل بیان مصائب سے دوچار ہونا پڑا ہے اور ہندوستان میں اس تحریک کے جلو میں کس قسم کی بربادیاں آنے والی ہیں تو اس نیم براعظم کے سلیم الفطرت افراد کی ایک معقول تعداد نے اس موضوع پر سوچنا شروع کیا اور اس کی تباہ کاریوں سے ملک کو بچانے کے لیے مشورے ہونے لگے لیکن جو لوگ اس تحریک کے سرخیل تھے اُن کے سامنے چونکہ انسانیت کی فلاح و بہبود کے بجائے ہندوستان میں ہندو قوم کا تسلط اور غلبہ تھا اور یہ مقصد وطنی قومیت کی تحریک ہی سے بطریق احسن پورا ہونے کی توقع کی جا سکتی تھی اس لیے انہوں نے مولانا محترم کی آواز کو ہر طرح سے دبانے کی کوشش کی اور پوری قوت کے ساتھ عوام کے اندر یہ تاثر پھیلایا کہ یہ شخص آزادیٔ ہند کے فیصلہ کن مرحلے پر جو وطنی تحریک کی مخالفت کر رہا ہے تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ انگریز کے اشارے پر کیا جا رہا ہے۔ اول تو سادہ لوح عوام کے لیے نیشنلزم اور حب الوطنی کے درمیان فرق کرنا ہی مشکل تھا۔ دوسرے اس وقت ہندوستان کی سیاست میں جو جذباتی فضا قائم ہو چکی تھی اس میں تحریک اسلامی کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔

وطنی قومیت پر گرفت کرنے کے بعد جب مولانا محترم نے مسلم نیشنلزم پر گرفت شروع کی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا ذکر کیا تو مسلم قومیت کے علمبردار بڑے برہم ہوئے اور انہوں نے مولانا کے پیش کردہ افکار پر علمی انداز میں گفتگو کرنے اور دلائل سے اُن کی غلطی اُن پر واضح کرنے کے بجائے انہیں ملت اسلامیہ کا دشمن اور تحریک پاکستان کا مخالف قرار دینا شروع کیا اور یہ سلسلہ آج تک چل رہا ہے۔ عامۃ المسلمین کے دماغ مسلم نیشنلزم کے اثرات سے اس حد تک متاثر ہو چکے تھے کہ ان کی سمجھ میں یہ بات

نہ آتی تھی کہ اسلام کا داعی آخر مسلم قومیت کی تحریک کے ساتھ شامل ہو کر کیوں نہیں چلتا اور وہ اس تحریک کو جو مسلمانوں کے لیے ایک الگ خطہ ارضی کا مطالبہ لے کر اٹھی ہے کیوں ہدف تنقید بنا رہا ہے۔ مسلم نیشنلزم کے پرجوش حامیوں کی مولانا کے خلاف برہمی کا سبب بجز اس کے اور کوئی نہ تھا کہ وہ شدت جذبات میں اس عظیم فرق کو سمجھنے کے لیے آمادہ نہ تھے جو اسلام بحیثیت مسلمانوں کے قومی دین کے اور اسلام بحیثیت خدا کی طرف سے نازل کردہ واحد دستور حیات کے مابین پایا جاتا ہے اور اس فرق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے مولانا آج تک معتوب چلے آرہے ہیں۔

جماعت اسلامی کے سیاسی کردار پر ماضی اور حال میں جو لے دے ہوتی رہی ہے اس کا اگر دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ باوجود کوشش کے عوام ابھی تک اس فرق کے مضمرات ٹھیک طور پر سمجھ نہیں پائے اسی وجہ سے وہ بسا اوقات جماعت کے طرز عمل پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں جن میں کہیں کہیں سخت برہمی بھی ہوتی ہے۔

یہ بات اگرچہ بڑی تلخ ہے مگر ہے حقیقت کہ مختلف تاریخی، معاشرتی اور سیاسی عوامل کی وجہ سے اسلام سے گہری محبت اور عقیدت کے باوجود مسلمانوں کا اس دین سے وہ تعلق خاطر نہیں رہا جس کا دین حق تقاضا کرتا ہے۔ اسلام اُن کے نزدیک دوسرے قومی ورثوں کی طرح بس ایک مقدس قومی ورثے کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس کے ساتھ وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی حد تک وابستہ رکھنے کے لیے مجبور ہیں۔ اس حقیقت کو یوں بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ مسلم قومیت کی تشکیل میں جہاں سیاسی مصالح کی ہم آہنگی، معاشی مفادات کا اشتراک اور معاشرتی اور اخلاقی اقدار کی یکجہتی اور اس طرح کے بعض دوسرے عوامل کارفرما ہیں۔ وہاں ایک دین سے وابستگی بھی اس قوم کے مختلف عناصر کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا ذریعہ بنتی ہے۔ لیکن قومیت کے اس نقشے میں دین حق کبھی اجتماعی زندگی کی غایت اولیٰ اور فکر و عمل کا واحد محرک قرار نہیں پا سکتا۔ اسی وجہ سے قومی، معاشی اور معاشرتی تقاضوں کے مطابق جسے عرف عام میں عصری تقاضے کہا جاتا ہے دین کے اندر بھی تبدیلیاں پیدا کرنے کا مطالبہ ہوتا رہتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں اصل چیز قوم اور اس کے دنیوی تقاضے ہیں اور دین ان تقاضوں کو پورا کرنے کے متعدد ذرائع میں سے ایک مؤثر ذریعہ ہے اور جب

قومی تقاضے تبدیل ہو جائیں تو دین کو اس کے مطابق تبدیل کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ دیکھئے کہ اس ملک کے جو افراد یا گروہ بھی مسلم نیشلزم کے جذبہ کے تحت ہماری اجتماعی زندگی میں دین کا مرتبہ و مقام مشخص کرنے میں مصروف ہیں وہ دین کو وقتی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کو دین کی بہت بڑی خدمت خیال کرتے ہیں۔ مرکز ملت کا تصور بھی اسی ذہنیت کی پیداوار ہے۔ اگر وطنی قومیت کے علمبردار وطن پہلے اور مذہب بعد کے داعی تھے تو مسلم قومیت کے علمبردار قوم پہلے اور مذہب بعد کے پرجوش مبلغ ہیں اور اس کی عملی شکل جو سامنے آئی ہے وہ یہ ہے قوم مذہب کی تابع نہ ہو اور وہ اپنی اجتماعی زندگی کا نقشہ اس کے مطابق تیار کرنے کی پابند نہ ہو بلکہ قوم دنیوی مفادات کے پیچھے جس وادی میں چاہے بھٹکتی پھرے اور مذہب ایک سچے جانثار خادم کی طرح بڑی نیازمندی کے ساتھ ہر مقام پر اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہے۔

قومی دین کا تصور نیشلزم کی تحریک کے ساتھ ہی پروان چڑھا ہے کیونکہ اس تحریک کی یہ ہمیشہ سے بنیادی ضرورت رہی ہے۔ مذہب آفاقی اقدار کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ انسانوں کے مابین حق و باطل کی بنیاد پر تفریق کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں نیشلزم کو ہر قدم پر اس بات کی احتیاج ہوتی ہے کہ قوم کے مخصوص دنیوی مفادات اور مخصوص حالات کے پیش نظر اخلاقی اور مذہبی اقدار وضع کرے۔ اس لیے وہ کسی ایسے مذہب کی عملداری ایک لمحہ کے لیے گوارا نہیں کر سکتا جو زندگی کے سارے شعبوں پر محیط ہونے کا دعویٰ کرے اور آفاقی اقدار کا علمبردار ہو۔ یورپ میں اصلاح مذہب کے نام سے جو تحریک شروع ہوئی وہ درحقیقت نیشلزم کے فروغ پانے کی وجہ سے قومی مذہب کی ضرورت کا بالکل فطری اظہار تھا۔ قوموں کے دنیوی مفادات اس بات کے متقاضی تھے کہ مذہب کی جو اقدار بھی نیشلزم کو کوئی نقصان پہنچا سکتی ہیں یا قوموں کی صنعتی ترقی یا جوع الارض کی راہ میں حائل ہو سکتی ہیں انہیں نقش کہن سمجھ کر بالکل مٹا دیا جائے۔ اس تحریک کے نتیجے میں یورپ میں قومی چرچ کی بنیاد پڑی۔ اس ضمن میں جن لوگوں کو قومی مفادات کا دشمن یا قومی چرچ کا مخالف سمجھ کر تختہ دار پر لٹکایا گیا اُن میں سے کوئی ایک شخص بھی نہ تو کسی قوم اور وطن کا غدار تھا، نہ اس کے مفادات کا دشمن۔ ان کا قصور لے دے کر صرف یہ تھا کہ وہ مذہبی تعلیمات کو بادشاہوں یا قومیت کے علمبرداروں کی خواہشات کے مطابق تبدیل کرنے پر تیار نہ تھے۔ سر ٹامس مور جسے اس جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا اس کے وہ آخری الفاظ تاریخ کے صفحات میں آج بھی محفوظ ہیں جن سے قتل کے اصل

باقی صفحہ ۴۴ پر

محرکات کا صاف اندازہ ہوتا ہے۔

انگلستان میں قومی مذہب کی بنیاد ہنری ہشتم کے عہد سے پہلے پڑ چکی تھی اور ملک کے حکمراں، سرمایہ دار اور برسر اقتدار طبقے اس بات کے آرزومند تھے کہ کوئی طاقتور ہاتھ مذہب کی بالادستی ختم کر کے اسے قومی مفادات کے سامنے سرنگوں کر دے۔ لیکن اس کشمکش نے فیصلہ کن صورت ہنری ہشتم کی ازدواجی زندگی کے مسئلہ پر اختیار کی۔ بادشاہ اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر پوپ اس کی اجازت دینے پر آمادہ نہ تھا۔ اس سلسلے میں سرکردہ پادریوں کا ایک وفد بلایا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ اس معاملے میں شاہ کی تائید کریں ورنہ انہیں قتل کر دیا جائے گا۔ چنانچہ سب نے موت کے خوف سے شاہ کی طرف سے پیش کردہ اجازت نامے پر دستخط کر دیئے۔ اسی اثناء میں ایک عمر رسیدہ پادری اٹھا اور اس نے کہا۔ حضور! یہ اجازت نامہ اس وقت تک دفتر بے معنی ہے جب تک سر ٹامس مور اس پر اپنے دستخط ثبت نہ کر دے۔ چنانچہ ٹامس مور کو حکم دیا گیا کہ وہ اس کی توثیق کرے۔ لیکن اُس نے صاف انکار کر دیا۔ شاہ نے اسے سزا دینے کے لیے ایک ٹربیونل قائم کیا جس نے اسے بادشاہ، ملک اور قوم کا دشمن گردانتے ہوئے موت کی سزا کا حکم سنایا۔ ٹامس مور نے تختہ دار پر کھڑے ہو کر جان، جان آفرین کے حوالے کرنے سے پہلے جو الفاظ کہے وہ قومیت اور مذہب کی باہمی کشمکش کے سلسلے میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اس شخص نے کہا:

"میں نے نہ تو بادشاہ سے غداری کی ہے، نہ ملک سے اور نہ قوم سے۔ میں بہر حال اپنے مالک کا اس بنا پر شکر گزار ہوں کہ میں اس ذات برحق کا ہمیشہ وفاشعار رہا ہوں جس کی اطاعت میرا اولین فرض ہے۔"

ان الفاظ کے پس پردہ اگر جھانک کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بلند ہمت انسان نیشنلزم کے عارضہ میں مبتلا ذہنوں پر ماتم کر رہا ہے جنہوں نے غلطی سے یہ فرض کر لیا ہے کہ قوم کی خدمت اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان خدا اور مذہب سے بے وفائی کرنے پر تیار ہو اور اگر وہ خدا، رسول اور دین کی اطاعت کو اپنی زندگی کا بنیادی مقصد سمجھتا ہے اور حیلہ وفاداریوں کو دین کی وفاداری کے تابع رکھ کر زندگی بسر کرنے کا عزم رکھتا ہے تو وہ لازمی طور پر ملک و قوم کے مفادات کا دشمن ہی ہے۔ معلوم نہیں کہ قومیت کے علمبرداروں کو اس بات کا شعور ہے یا نہیں لیکن یہ بات بالکل صحیح

ہے کہ انسان فطری طور پر صرف معبود واحد کی بندگی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اگر وہ خداوند تعالیٰ کو اپنا معبود ٹھہراتا ہے تو پھر تعلقات کی ساری عمارت اس معبود حقیقی کی خوشنودی اور ناراضگی کے مطابق استوار کی جائے گی اور اگر وہ قوم اور ملک کو اپنا معبود بناتا ہے تو پھر زندگی کی ساری اقدار اسی کے مطابق متعین کی جائیں گی اور خدا اور مذہب کے ساتھ تعلق قومی اور ملکی مفادات کے تابع ہوگا۔

بعض لوگ مسلم قومیت کے خلاف اسلام کے اس موقف کو سن کر بڑی سادگی سے یہ کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام مسلم قوم کے مفادات اور اس کی ترقی کا دشمن ہے۔ یہ لوگ دین حق کے خلاف اپنے دل کی کدورت کو چھپانے کے لیے بڑی عیاری سے اسلام کی بجائے مُلّاں کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اُن کے اندازِ فکر اور اندازِ بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے ذہن میں جو چیز پرورش پا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام مسلم قوم کی ترقی کی راہ میں حائل ہے اس لیے اُس سے کسی طرح پیچھا چھڑانا چاہیئے یا اگر یہ بات موجودہ حالات میں جلد ممکن نہ ہو تو پھر قومی مفادات کے نام پر دین حق کے اندر تعبیر و تاویل کے ایسے چور دروازے نکالنے کی ضرورت ہے جہاں سے قوم گزر کر جو چاہے کرتی پھرے اور عوام الناس کو اس امر کا احساس بھی نہ ہونے پائے کہ اُس نے دینی حدود کو توڑنے اور پامال کرنے کا جرم کیا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ قومی مفادات اور دینی تقاضے لازمی طور پر ہر مرحلے میں ایک دوسرے سے متصادم ہی ہوں بلکہ بسا اوقات تو یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے ہم عناں ہوتی ہیں اور قومی مفادات دینی تقاضوں کو پورا کرنے کی وجہ سے بہتر طور پر حاصل ہو جاتے ہیں۔ لیکن دین کے علمبرداروں اور قومیت کے پرستاروں کے درمیان فیصلہ کن چیز یہ ہوتی ہے کہ جب ان دونوں میں تصادم ہو جائے تو کونسا طرز عمل اختیار کیا جائے۔ دین کے علمبرداروں کا موقف یہ ہوتا ہے کہ ایک مخلص اور سچے خدا پرست کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر معاملے میں یہ دیکھے کہ اس بارے میں خدا کا حکم کیا ہے اور صرف اسی حکم کو بجا لانے کی پوری کوشش کرے خواہ اس کی بجا آوری میں اسے یا اس کی قوم کو بظاہر کتنا بڑا نقصان اٹھانا پڑے۔ کلمہ طیبہ میں اثبات سے پہلے نفی کا ذکر اس حقیقت کی طرف نہایت واضح طور پر اشارہ کرتا ہے اس کے برعکس قومیت کے پرستاروں کے نزدیک مذہب ایک مفید شے ہے بشرطیکہ وہ قومی مفادات سے متصادم نہ ہو لیکن جہاں

اس بات کا کوئی معمولی خدشہ بھی نظر آتا ہو کہ کسی دینی حکم کی پیروی سے ان کی قوم کو کسی ادنیٰ سے دنیوی مفاد سے محروم ہونا پڑیگا تو قوم سے محبت اور وفاداری کا تقاضا یہ ہے کہ اس دنیاوی مفاد کی خاطر دین کے اصول کو قربان کر دیا جائے۔

تاریخ پاک و ہند میں اسلام اور مسلم قومیت کے درمیان یہ آویزش یوں تو خاصی دیر سے چلی آرہی ہے۔ لیکن اس نے تصادم کی صورت سرسید کی تحریک اصلاح مذہب کے بعد اختیار کی ہے اور مسلم قوم کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا ہے جہاں قوم کو اس امر کا قطعی فیصلہ کرنا ہوگا کہ کیا اسے دین کی علمبردار بن کر اپنے مفادات کو دین کے تابع رکھ کر زندگی بسر کرنا ہے یا قومی مفادات کے نام پر دین کے اصولوں کو قربان کر کے یا دین کو اہل یورپ کے قومی ادیان کی طرح بالکل بے جان اور غیر موثر بنا کر زندہ رہنا ہے۔ مولانا محترم نہ تو قوم کے بدخواہ ہیں اور نہ اس کے دنیوی مفادات کے دشمن اور نہ اس کی کسی جائز اجتماعی آرزو کے مخالف۔ ان کا اور ان کے رفقاء کار کا اگر اس سلسلے میں کوئی جرم ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ خدا کی اطاعت اور اس کے ساتھ وفاداری کو مسلمانوں کا اولین فرض قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز کے ساتھ آدمی کی وفاداری حق کے ساتھ وفاداری کے تابع ہونی چاہیئے۔

انسانوں کا یہ گروہ جسے اللہ تعالیٰ نے شاہد علی الناس کے نام سے پکارا ہے اور جسے امتِ وسط کے معزز لقب سے ملقب کیا ہے خدا اور خلق کی نظر میں اس وقت تک کسی عزت و تکریم کا مستحق ہے جب تک کہ وہ اپنے قول و عمل سے یہ ثابت نہ کر دے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں حق کا داعی اور علمبردار ہے اور اس کی خاطر ہر دوسرے مفاد کو قربان کرنے کے لیے آمادہ ہے، خواہ یہ مفادات ذاتی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے چھوٹے ہوں یا بڑے۔ مولانا محترم کے مخالفین نے ان کے خلاف جرائم کی جو لمبی چوڑی فرد تیار کی ہے اگر اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان سب جرائم کے عنوان اگرچہ جدا جدا ہیں مگر ان کی اصل ایک ہی ہے کہ وہ بنی نوع انسان سے اور خصوصاً مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ نفس پرستی، قوم پرستی، وطن پرستی اور مفاد پرستی کے بجائے خدا پرستی کی روش اختیار کرو کیونکہ خدا کا دین تم سے بحیثیت بندۂ رب اسی بات کا متقاضی ہے۔ اگر یہ فی الحقیقت جرم ہے تو پھر مولانا محترم اور ہم سب مجرم ہیں اور اپنے اس جرم پر نادم اور پشیمان ہونے کے بجائے ہم سب

رب العزت کا شکر بجا لاتے ہیں کہ مفاد پرستی اور قوم پرستی کے اس تاریک دور میں اُس نے ہمیں، ہماری بہت سی کوتاہیوں کے باوجود، حق کی سربلندی اور خدا پرستی کی تبلیغ کی توفیق عطا کی ہے۔

جماعت اسلامی کی دعوت کی طرح اس کا طریق کار بھی مختلف حلقوں میں بڑی بے جا تنقید کا ہدف بنا رہتا ہے۔ کسی گوشے سے یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ جماعت نے اقامت دین کے جس مقدس کام کا آغاز کیا تھا اسے چھوڑ کر اب اس نے سیاست کا ناپاک دھندا شروع کر دیا ہے، کسی گوشے میں یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی نے اسلامی نظام حیات کی عملداری ترک کر کے اب جمہوریت کی سربلندی کو اپنا مسلک ٹھہرالیا ہے، کسی گوشے سے اُسے نصب العین سے انحراف کے طعنے دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان سارے اعتراضات پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جماعت اسلامی کے قافلے کو آگے بڑھانے کے لیے اُس کے قائدین کو مختلف مراحل پر جو مختلف تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں انہیں بدقسمتی سے نصب العین سے انحراف سمجھ لیا جاتا ہے۔ جماعت اسلامی کا طریق کار بڑا سادہ، فطری اور دینی تقاضوں کے عین مطابق ہے اور وہ یہ ہے کہ دعوتِ دین کے کام کو زیادہ سے زیادہ پھیلایا اور مؤثر بنایا جائے اور اسلامی نظامِ حیات کے قیام کے لیے راہ ہموار کی جائے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ اس کام کے لیے جو تدابیر اختیار کی جائیں گی ان سب کے پیچھے اگرچہ روح ایک ہی کارفرما ہوگی مگر حالات کے اختلاف کی وجہ سے ان کی ہیئت مختلف ہوگی۔ کیا پاکستان، بھارت، انگلستان، افغانستان اور روس ان سب ممالک میں دعوتِ دین کے کام کو ایک ہی انداز سے آگے بڑھانا ------ ممکن ہے۔ ان میں اس دعوت کو پھیلانے کے لیے ہر ملک کے مخصوص حالات کو سامنے رکھ کر ہی کام کا کوئی نقشہ تیار کیا جائے گا۔

پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد جماعتِ اسلامی کی سیاست میں غیر معمولی دلچسپی کی وجہ یہ نہیں کہ اب اس نے اللہ کے دین کے کام کو چھوڑ کر حصولِ اقتدار کو اپنا مقصود بنالیا ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی ایمانداری سے یہ سمجھتی ہے کہ اگر یہاں کے عوام اپنی دینی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے اس ملک کی زمامِ کار خدا ترس لوگوں کو سونپ دیں تو اس سے نہ صرف ملک مضبوط اور قوم متحد ہوگی بلکہ ملک و ملت کے وسیع ذرائع سے دعوتِ دین کے کام کو بین الاقوامی سطح پر بڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھایا جاسکے گا اور وہ ذرائع جو اب دین کی راہ روکنے کے لیے استعمال کیے جا رہے ہیں وہ

حق کی سربلندی کے لیے استعمال کیے جاسکیں گے۔

اسی طرح اگر جماعت اسلامی ملک میں جمہوریت کے فروغ پر زور دے رہی ہے تو اس کا سبب یہ نہیں کہ جمہوریت اب اس کا جزو ایمان بن گئی ہے۔ وہ آج بھی مغربی جمہوریت کو اسی طرح کا ایک کافرانہ نظام سمجھتی ہے جس طرح کہ پہلے سمجھتی تھی اور جس کی شد و مد سے مخالفت کرتی رہی ہے۔ وہ اگر آج جمہوریت کی حامی ہے تو مغربی جمہوریت کی نہیں بلکہ اسلامی جمہوریت کی اور موجودہ حالات میں وہ جمہوریت کے حق میں جو رائے عامہ ہموار کر رہی ہے تو محض اس بنا پر کہ آمریت کے مقابلے میں جمہوری نظام کے اندر کام کرنے کی نسبتاً زیادہ آزادی ہوتی ہے۔ ہمیں جمہوریت کی غیر مرئی اور بے رحم جکڑ بندیوں کا بخوبی اندازہ ہے اور ہمیں یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ اس نظام کا پورا تانا بانا ہی اسی انداز سے تیار کیا جاتا ہے جس میں کوئی مخالف نظام بڑی آسانی کے ساتھ پنپ نہیں سکتا۔ لیکن پاکستان کے مخصوص فکری پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں اگر آمریت کے بجائے صحیح جمہوری نظام بھی باقی رہ جائے تو دعوتِ دینی کے کام کو مستبد آمرانہ نظام کے مقابلے میں نسبتاً آسانی کے ساتھ آگے بڑھانا ممکن ہوگا۔ اگرچہ اس میں بھی بہت کچھ دشواریاں پیش آئیں گی۔ جمہوریت ہماری منزلِ مقصود نہیں بلکہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا محض ایک ذریعہ اور تدبیر ہے۔ لیکن ہمارے کرم فرما دنیا کو یہ تاثر دے رہے ہیں کہ ہم نے اپنی منزل تبدیل کر کے اپنے اصل موقف سے انحراف کر لیا ہے اور ایک کافرانہ نظام کے حفظ و بقا کے لیے اپنی قوتیں ضائع کر رہے ہیں۔